حقیقت ربا اور اس کی اطلاقی نوعیت

ڈاکٹر محمد شکیل اوج
استاد الفقہ و التفسیر شعبہ علوم اسلامی، جامعہ کراچی

سب سے پہلے قرآنی آیات کی روشنی میں ربا کی حقیقت کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ نزولی اعتبار سے آیات ربا کی ترتیب کچھ یوں ہے۔ سب سے پہلے سورہ روم پھر سورۃ النساء پھر سورۃ آل عمران اور سب کے بعد سورۃ البقرہ کی آیات جس میں سب سے زیادہ تفصیل ہے۔ آیات ربا کی ترتیب متد ریجی پہلو سے بھی متعدد حکمتوں اور مصلحتوں سے مالا مال ہے۔ اب ذیل میں ترتیب وار ان آیات کو دیکھیے۔

فآت ذاالقربی حقہ والمسکین وابن السبیل ذلک خیر للذین یریدون وجہ اللہ واولٰئک ھم المفلحون○ وما اٰتیتم من ربا لیربوا فی اموال الناس فلا یربوا عند اللہ وما اٰتیتم من زکوۃ تریدون وجہ اللہ فاولٰئک ھم المضعفون○ (سورۃ الروم)

ترجمہ: ''اور جو مال تم ربا کے طور پر دیتے ہو تا کہ (تمہارا اثاثہ) لوگوں کے مال میں شامل ہو کر بڑھتا رہے تو وہ اللہ کے نزدیک نہیں بڑھتا البتہ جو مال تم زکوۃ کے طور پر دیتے ہو (فقط) اللہ کی رضا چاہتے ہوئے تو وہی لوگ (اپنا مال عنداللہ) کثرت سے بڑھانے والے ہیں''۔

اس مقام پر ہر صاحب حیثیت شخص کے مال میں اس کے قریبوں، مسکینوں اور مسافروں یا مہمانوں کا حق بیان کیا گیا ہے۔ حق کا لفظ وجوبی اور استحبابی ہر دو معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ صورت حال واحوال اس کے مطلوب معنی کو متعین کرتے ہیں، جہاں شدید ضرورت داعی ہوتی ہے وہاں اسے واجب کے معنی میں لے لیا جاتا ہے، البتہ جہاں ضرورت شدید نہ ہو تو وہاں استحباب کے معنی اخذ کر کے معاملہ کیا جاتا ہے۔

دوسری آیت میں ربا اور زکوۃ کو ایک دوسرے کے مقابلہ پر لایا گیا ہے، جس سے ربا کی حقیقت بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے۔ جن لوگوں نے یہاں ربا سے مراد تحفہ ہدیہ اور نیوتے وغیرہ کو لیا ہے،

انہوں نے ساتھ ہی ربائے حلال کا تصور بھی پیش کیا ہے۔ (۱)

ہمارے نزدیک اس جگہ ربائے حلال کا تصور غیر ضروری معلوم ہوتا ہے، البتہ یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید نے غیر متعین مگر لازمی منافع کو بھی ربا سے تعبیر کیا ہے جو تحفے، ہدیے اور نیوتے کی جوابی شکل میں دینے والے کے پاس واپس لوٹ کر آتے ہیں۔ تاہم اگر یہاں تحفے، ہدیے اور نیوتے سے ہٹ کر بھی ربا کا مفہوم سمجھا جائے تو وہ بھی آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ مطلب یہ کہ اس سے مراد کوئی مال (روپیہ) بھی ہو سکتا ہے۔ جو لوگوں میں بڑھوتری کے لیے دیا جاتا ہے۔ اسی مال کو اللہ نے اپنے قانون میں غیر ترقی یافتہ بتایا ہے۔ ''فلا یربوا عنداللہ'' کی تفسیر اخروی پہلو سے یہ کی گئی ہے کہ ایسے ربا کو اللہ کے ہاں اجر سے محروم رکھا جاتا ہے اور دنیوی پہلو سے اس کی تفسیر یہ ہے کہ خدا کے قانون میں ایسے ربا کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اسی لئے زکوۃ کا لفظ ربا کے مقابلہ پر رکھا گیا ہے تا کہ معاشرے کے مجموعی مفاد کو ترقی یافتہ بنایا جائے۔ مقصود کلام یہ کہ ربا سے معاشرے کا مجموعی مفاد بتدریج گھٹتے گھٹتے بالآخر ختم ہو جاتا ہے، جبکہ زکوۃ سے بڑھ جاتا ہے۔

اس تصور کی اصل ''ولا تمنن تستکثر'' (المدثر، ۶) میں دیکھی جاسکتی ہے۔

اور (اس غرض سے کسی پر) احسان نہ کیجیے کہ اس سے زیادہ کے طالب ہوں۔

فبظلم من الذین ھادوا حرمنا علیھم طیبٰت أحلت لھم وبصدھم عن سبیل اللہ کثیرا واخذھم الربوا وقد نھوا عنہ واکلھم اموال الناس بالباطل واعتدنا للکٰفرین منھم عذابا الیما○لٰکن الراسخون فی العلم منھم والمؤمنون یؤمنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک والمقیمین الصلوٰۃ والمؤتون الزکوۃ والمؤمنون باللہ والیوم الاٰخر اولٰئک سنؤتیھم اجراً عظیما○ (النساء، ۱۶۰۔۱۶۲)

ترجمہ: ''پھر یہودیوں کے ظلم ہی کی وجہ سے ہم نے ان پر (کئی) پاکیزہ چیزیں حرام کر دیں جو (پہلے) ان کے لیے حلال کی جا چکی تھیں اور اس وجہ سے (بھی) کہ وہ (لوگوں کو) اللہ کی راہ سے بکثرت روکتے تھے اور ان کے اخذ ربا کے سبب سے، حالانکہ وہ اس سے روکے گئے تھے یعنی ان کے لوگوں کا ناحق مال کھانے کی وجہ سے اور ہم نے ان میں سے کافروں کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے، لیکن ان میں سے پختہ علم والے اور مومن لوگ اس (وحی) پر جو آپ کی طرف نازل کی گئی ہے اور اس (وحی) پر جو آپ سے پہلے نازل کی گئی (برابر) ایمان لاتے ہیں اور وہ (کتنے اچھے ہیں کہ) صلوۃ قائم کرنے والے

(ہیں) اور زکوٰۃ دینے والے (ہیں) اور اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھنے والے (ہیں) ایسے ہی لوگوں کو ہم عنقریب بڑا اجر عطا فرمائیں گے۔"

اس جگہ پہلی آیت میں یہودیوں کے وہ جرائم بیان کیے گئے ہیں جن کی بنیاد پر پاکیزہ حلال چیزیں ان پر حرام ہوگئیں۔ گویا یہ وہ پاداشِ عمل تھا جو نافرمانوں کو ان کے جرائم کی بنیاد پر خدا کے قانون مشیت و مکافات کے تحت رونما ہوا۔ ظاہر ہے کہ جو قوم ظالم ہو، اللہ کے قانون پر لوگوں کو عمل کرنے سے روک رہی ہو، ربا جس سے منع کیا گیا تھا اسی کو اختیار کر رہی ہو یعنی لوگوں کے مال باطل طریقوں سے کھا رہی ہو تو ایسی قوم در اصل اپنے اعمال بد کے نتیجے میں خود پر حلال و طیب اشیاء کو حرام کر لیتی ہے۔

اس آیت میں جرائم یہود میں ربا کو جس طرح بیان کیا گیا ہے اس طرح کسی بھی جرم کو بیان نہیں کیا گیا۔ پہلی بات تو یہ کہ ربا کے ساتھ اخذ کا لفظ استعمال ہوا اور اخذ کا لفظ کسی چیز کو شدت سے پکڑنے اور اختیار کرنے کے لیے مستعمل ہے۔ اس میں غلبہ و استیلاء کا مفہوم بھی شامل ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ یہودیوں نے ربا کو شدت سے اپنی زندگی میں اختیار کر رکھا ہے۔ دوسرے یہ کہ "وقد نہوا عنہ" کے الفاظ اسی جرم کے ساتھ خص کیے گئے ہیں، حالانکہ حکم بھی "وقد نہوا عنہ" میں آتا ہے۔ اور دوسرے جرائم بھی اسی کے ذیل میں آتے ہیں مگر ان کے ساتھ یہ الفاظ نہیں لائے گئے۔ اس سے ربا کی شدت اور ہولناکی واضح ہوتی ہے۔

اس آیت میں ربا کی تاریخی تعیین کم از کم یہودیت کے حوالے سے موجود ہے، جس میں اس کے نہی ہونے کا حوالہ بھی ہے اور ربوی طرز زندگی اختیار کرنے والوں کے لیے تعریض کا سامان بھی موجود ہے۔ پھر اگلی آیت میں جن اہل کتاب علماء اور عام مومنین کے مشرف با اسلام ہونے کا ذکر کیا گیا ہے ان کی خصوصیات میں مقیمین الصلوٰۃ اور موتون الزکوٰۃ کے الفاظ بھی لائے گئے ہیں۔

خلاصہ کے طور پر کہا جاسکتا ہے کہ سورۃ الروم کی طرح سورۃ النساء میں بھی ربا کے مقابلے پر زکوٰۃ کو رکھا گیا ہے۔ اس تقابل سے ربا کی حقیقت مزید نکھر کر سامنے آتی ہے۔

یاایہا الذین امنوا لا تاکلوا الربوا اضعافا مضعفۃ واتقوا اللہ لعلکم تفلحون ○ واتقوا النار التی اعدت للکفرین ○ واطیعوا اللہ والرسول لعلکم ترحمون ○ وسارعوا الی مغفرۃ من ربکم وجنۃ عرضہا السموت والارض اعدت للمتقین ○ الذین ینفقون فی السراء والضراء والکاظمین الغیظ والعافین عن

الناس واللہ یحب المحسنین ○ (آل عمران: ۱۳۰-۱۳۴)

ترجمہ: "اے ایمان والو! دو گنا اور چوگنا کر کے سود مت کھایا کرو اور اللہ سے ڈرا کرو تاکہ تم فلاح پاؤ اور اس آگ سے ڈرو، جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے اور اللہ کی اور رسول (ﷺ) کی فرمانبرداری کرتے رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے اور اپنے رب کی مغفرت اور اس جنت کی طرف تیزی سے بڑھو جس کی وسعت میں سب آسمان اور زمین آجاتے ہیں جو پرہیزگاروں کے لیے تیار کی گئی ہے، یہ تو وہ لوگ ہیں جو فراخی اور تنگی (دونوں حالتوں) میں خرچ کرتے ہیں اور غصہ ضبط کرنے والے ہیں اور لوگوں سے (ان کی غلطیوں پر) درگزر کرنے والے ہیں اور اللہ احسان کرنے والوں سے محبت فرماتا ہے۔"

اس مقام پر پہلی مرتبہ براہ راست مسلمانوں کو مخاطب کر کے انہیں ربا کھانے سے روکا گیا ہے۔ "اضعافا مضعفۃ" کے الفاظ سے پتہ چلتا ہے کہ اس دور میں ربا اس قدر پھیل چکا تھا کہ معاشی اقدار میں زر اصل ناپید ہو چکا تھا۔ لوگ ربا کے کاروبار میں اتنا آگے بڑھ چکے تھے کہ اصل سے کئی گنا اوپر ربائے جبر کا معاشی نظام ان پر بری طرح مسلط تھا۔ لوگ قرض کس طرح اتارتے؟ قرض پر جو ربا کا جبر تھا، وہ چند در چند ہو چکا تھا اور لوگ اسی چند در چند ربا کو اتارنے کے لیے گویا پھر قرض لینے پر مجبور تھے یا مہلت ادائیگی بڑھوانے کے لیے اصل پر مزید اضافہ برداشت کرتے تھے۔ یوں قومی مفاد کا مجموعی سرمایہ تو گھٹ رہا تھا اور قومی سرمائے کا مجموعی خسارہ بڑی شدت سے بڑھ رہا تھا۔ گویا۔

حساب۔ مال کا اتنا سا گوشوارہ تھا
ربا نکال کے دیکھا تو سب خسارہ تھا

بعض لوگوں نے "اضعافا مضعفۃ" کو ربائے مرکب سے تعبیر کرتے ہوئے یہ نکتہ آفرینی کی ہے کہ آیت مذکورہ میں لوگوں کو دوہرے چوہرے ربا سے روکا گیا ہے، ربائے مفرد سے نہیں۔ مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ الفاظ تصویر حال کے طور پر آئے ہیں تاکہ معاشی ظلم و استحصال کا حقیقی چہرہ بے نقاب ہو سکے۔

یہاں آیت ربوا کے تسلسل میں جو الفاظ آئے ہیں انہیں بھی ایک نظر دیکھ لیجیے۔ مثلاً "واتقوا اللہ لعلکم تفلحون ○ جو آیا ہے اس کا تعلق حکم ربا کے ساتھ ہے۔ مطلب یہ کہ اللہ کے قانون پر چلو، جس کا نتیجہ فلاح و کامرانی ہے۔ پھر واتقوا النار التی اعدت للکفرین ○ کہہ کر ربوا کھانے والوں کو جہنم کی آگ سے ڈرایا گیا ہے اور اس سے اگلی آیت میں رحمتوں کے انعام کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کا ثمرہ بتایا گیا ہے اور پھر اپنے پروردگار کی مغفرت کی طرف دوڑنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہاں

مغفرت کا لفظ جس طرح سزاؤں سے حفاظت یعنی بخشش و معافی کے مفہوم پر دلالت کرتا ہے، وہیں ظلم واستحصال سے حفاظت پر بھی دلیل بنتا ہے۔ ذرا آگے چل کر پھر انہی لوگوں کو متقین بھی قرار دیا گیا ہے اور متقین کے باب میں بتایا گیا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو راحت و تکلیف، خوش حالی و بدحالی اور آسودگی و تنگی ہر دو صورتوں میں انفاق کرتے ہیں۔ (الذین ینفقون فی السراء والضراء)۔

خلاصہ بحث یہ کہ سورۂ آل عمران میں ربا کے مقابل انفاق کا ذکر ملتا ہے۔ جس طرح سورۃ الروم اور سورۃ النساء میں زکوٰۃ کا۔ یہ سب بلا وجہ نہیں ہے، اسے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

سورۃ البقرہ کی آیات ربا سے متصل پہلے والے رکوع میں تین الفاظ خصوصی توجہ کے متقاضی ہیں جو سب کے سب اسلام کے معاشی حالات سے تعلق رکھتے ہیں۔ نفق کے مادہ سے انفقوا، انفقتم، تنفقوا، ینفقون اور ینفقون کے الفاظ آئے ہیں۔ علاوہ ازیں انفاق کے ساتھ نذر کا لفظ بھی آیا ہے اور صدقات کا بھی۔ پھر ان اصطلاحوں میں معاشی بہبود و کفالت کے احکام کے بعد ربوا کا مضمون شروع ہوتا ہے اور سورۃ البقرہ کی آیت نمبر ۲۷۶ میں تو دو ٹوک فیصلہ سنایا گیا ہے۔

یمحق اللہ الربوا ویربی الصدقات

ترجمہ: ''اللہ ربا کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے''۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ انفاق، نذر اور صدقات کے ذریعے معاشی و معاشرتی بہبود و کفالت کے احکام کو روبہ عمل لانے کے بعد یہ ناممکن ہے کہ ربا نہ مٹے اور صدقات نہ بڑھیں۔ اور اگر اس حکم کو پیشگوئی کے رنگ میں لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ اللہ کے قانون پر عمل کرنے سے بالآخر ربا مٹ جائے گا اور صدقات پھیل جائیں گے اور ایک نہ ایک دن ضرور ایسا ہو کے رہے گا۔

سورۃ البقرہ کی اس آیت میں ربا کے مقابلے پر صدقات کا لفظ لایا گیا ہے۔ بالکل اسی طرح، جس طرح سورۂ آل عمران میں انفاق اور سورۃ النساء اور سورۃ الروم میں زکوٰۃ کا لفظ۔ بات دراصل یہ ہے کہ زکوٰۃ ہو یا صدقات یا پھر نفقات، تینوں کا مقصود ایک ہے اور وہ یہ ہے کہ مال، امراء کے ہاتھوں سے نکل کر غرباء کے پاس آجائے۔ جبکہ ربا کا مقصود یہ ہے کہ مال غرباء کے ہاتھوں سے نکل کر امراء کے پاس چلا جائے۔ صدقے اور زکوٰۃ کے مستحقین بجائے لینے کے دینے والے بن جائیں تو ایسے معاشی سسٹم کو ربا یعنی ظلم سے تعبیر کیا جائے گا۔ اس تناظر میں ربا کی حقیقت کو سمجھنے کی مزید ضرورت ہے۔

ربا کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک ربا معاملاتی نوعیت کا ہے اور دوسرا قرضہ جاتی نوعیت کا۔ اور یہ دونوں قرآن سے سمجھے جاسکتے ہیں۔ سورۃ الروم اور سورۂ آل عمران کی آیات ربا قرضہ جاتی نوعیت کے مضمون کو ظاہر کرتی ہیں۔ جبکہ سورۂ بقرہ کے یہ فقرے ''قالوا انما البیع مثل الربوا واحل اللہ البیع وحرم الربوا''۔ تجارتی و معاملاتی نوعیت کے ربا کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس میں بیع اور ربا کو جو اکٹھا ذکر کیا ہے وہ یہی ظاہر کرتا ہے کہ ربا صرف قرض میں نہیں ہوتا، خرید و فروخت یعنی تجارت میں بھی ہوتا ہے۔ وہ تمام احادیث جنہیں ربا الفضل کے تحت بیان کیا جاتا ہے ان کی اصل اسی آیت کو سمجھنا چاہیے۔ بیع کو ربا کی مثل قرار دینے کی غلط فہمی اسی لیے تو ہوئی تھی کہ اگر مطلق زیادتی یا بڑھوتری کوئی جرم ہے تو بیع وشراء سے حاصل ہونے والا منافع بھی ایک طرح کا اضافہ ہے، پھر وہ غلط کیوں؟

ہمارے فقہاء نے قرضہ جاتی ربوا کو ربا القرآن یا ربوالنسیہ کا نام دیا ہے اور معاملاتی ربا کو ربا الحدیث یا ربا الفضل کا۔ ہمارے نزدیک ربا الحدیث بھی دراصل ربا القرآن ہی ہے کیونکہ اس کی حرمت ''واحل اللہ البیع وحرم الربوا'' میں آگئی ہے۔

ربائے قرضی کو ہمارے علماء نے ربا النسیہ سے تعبیر کیا ہے جو کہ ربا القرآن ہے مگر اس کی تفسیر و تفصیل میں یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ: جاہلیت میں ربا یہ تھا کہ کسی شخص کا کسی دوسرے پر قرض کسی مدت کے لیے واجب ہوتا تو جب مدت ختم ہونے لگتی تو مقرض اپنے قرض دار سے پوچھتا کہ تم قرض ادا کرو گے یا مزید مہلت لو گے۔ اگر وہ قرض ادا کر دیتا تو ٹھیک ورنہ مقرض اپنے قرضہ کی رقم میں اور قرض دار کی مہلت ادائیگی میں اضافہ کر دیتا۔ (۲)

علامہ ابن قیم، ربا النسیہ کو ربائے جلی اور ربا الفضل کو ربائے خفی سے تعبیر کرتے ہیں، ان کے نزدیک ربائے خفی کو اس لیے حرام کیا گیا ہے کہ وہ ربائے جلی کا ذریعہ بنتا ہے جبکہ ربائے جلی اپنے ضرر عظیم یعنی ظلم کی وجہ سے حرام ہے۔ (اعلام الموقعین، مطبوعہ دہلی ۱۳۱۳ھ، جلد اول، ص ۲۰۰۔۲۰۱)

ڈاکٹر فضل الرحمن کے بقول، ربائے جلی کی خصوصیت تضعیف فی القرض ہے۔ اس کے علاوہ بیوع فاسدہ (کھوٹے کاروبار) کی بہت سی ایسی شکلیں ہیں جن میں ربوا کی روح مراہنت (Profit Seeking) کارفرما ہے۔ اسی لیے علامہ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں۔ یطلق الربا علی کل بیع محرم یعنی ہر حرام بیع پر لفظ ربوا کا اطلاق ہوتا ہے۔ (فتح الباری، مطبوعہ مصر ۱۳۱۹ھ، ج ۴، ص ۲۵۰)

حرمت ربا کی علت، مقدار اور حکمت کے پیش نظر ہمیں اپنے معاشی اور مالیاتی سسٹم کو دیکھنا ہوگا۔ زمینداری اور جاگیرداری میں اگر صریح ظلم و استحصال پایا جائے گا تو اسے بھی ربوا کی قبیل میں رکھنا ہوگا۔ بحیثیت مجموعی ہماری موجودہ کاروباری زندگی بے جا نفع خوری (Profiteering) اور ذخیرہ اندوزی (Hoarding) پر مشتمل ہو چکی ہے۔ اس کے لیے جھوٹ، دھوکہ، فراڈ اور نہ جانے کون کون سے حربے اختیار کیے جاتے ہیں۔ ہمارے نزدیک عصر حاضر کی بے جا نفع خوری اور مصنوعی قلت پیدا کرنے کے لیے جو احتکار کیا جاتا ہے وہ بینکوں کے منافع کی نسبت زیادہ ضرر رساں اور مبنی بر ظلم و استحصال نظر آتا ہے۔ اس لیے جو حکم بینکوں کے منافع پر لگایا جاتا ہے۔ ذخیرہ اندوزوں اور نفع خوروں پر اس سے بڑا حکم لگانا چاہیے۔

جب کہ دوسری طرف یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ بینکوں کا ریٹ آف انٹرسٹ لینے کا اور ہے اور دینے کا اور۔ اس فرق کے باعث یہ اپنی اصل میں جابرانہ اور ظالمانہ تقسیم ہے بلکہ قرآن کی اس آیت کے ذیل میں اسے بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔

ویل للمطففین ○ الذین اذا اکتالوا علی الناس یستوفون ○ واذا کالوھم او وزنوھم یخسرون ○ (المطففین: ۱۔۳)

ترجمہ: "بربادی ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لیے، لوگ جب (دوسرے) لوگوں سے ناپ کر لیتے ہیں تو (ان سے) پورا لیتے ہیں اور جب انہیں (خود) ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو گھٹا کر دیتے ہیں"۔

واضح رہے کہ اس آیت میں ایک کردار زیر بحث ہے جو عدل کی راہ سے ہٹا ہوا ہے۔ ناپنے اور تولنے میں دوہرے معیار کو اس لیے سامنے لایا گیا ہے کہ بات آسانی سے سمجھ میں آ سکے۔ یہ دوہرا کردار جہاں بھی پایا جائے گا وہ اسی آیت کے ذیل میں آئے گا۔ چونکہ بینکوں کا کردار بھی اپنے ریٹ آف انٹرسٹ میں دوہرے کردار کا حامل ہوتا ہے، اس لیے یہ بھی ایک طرح کا ظلم ہے جب کہ قرآن ہر طرح کے ظلم کا خاتمہ چاہتا ہے۔

حواشی و حوالہ جات

(۱) مولانا محمد ادریس کاندھلوی نے سورۃ الروم کی آیت ۳۹ کے تحت لکھا ہے: "کسی شخص کو کوئی چیز اس نیت سے دینا کہ وہ مجھے اس سے زیادہ دے گا، بظاہر اگرچہ یہ ربا حرام نہیں مگر نیت اور ارادہ کے اعتبار سے یہ بھی ایک قسم کا ربا ہے۔ (معارف

القرآن، ج ۶، ص ۱۵۸)

مولانا فرمان علی (اہل تشیع) رقمطراز ہیں: "یہاں وہ ربا (سود) ہے جس کا کھانا جائز ہے، جس کا ذکر خداوند عالم نے اس آیت میں منع فرمایا ہے۔۔۔۔ اور تفسیر قمی میں حضرت امام جعفر صادق سے ربا کی دو قسموں کے بارے میں جو روایت نقل کی گئی ہے اس کی دلالت بھی اس امر پر ہوتی ہے کہ اس آیت میں ربا سے مراد حلال و جائز قسم ہے۔ (اردو ترجمہ مع حاشیہ)

اور علامہ غلام رسول سعیدی ارقام فرماتے ہیں: "اس آیت میں سود سے مراد وہ ہدیہ ہے جس میں ہدیہ دینے والا اس سے افضل چیز کا طالب ہو۔ یہ حقیقتاً سود نہیں ہے لیکن صورۃً سود کے مشابہ ہے، اس لیے اس کو سود فرمایا ہے، یہ جائز ہے اس میں ثواب ہے نہ گناہ۔ ہمارے عرف میں اس کو "نیوتا" کہتے ہیں"۔

علامہ سعیدی مزید فرماتے ہیں: "علامہ ابوبکر محمد بن عبداللہ ابن العربی المالکی (المتوفی ۵۴۳ھ) لکھتے ہیں: "البقرہ ۲۷۹ میں جس ربا کا ذکر ہے وہ حرام ہے اور اس آیت میں جس ربا کا ذکر ہے وہ حلال ہے"۔ علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی (المتوفی ۶۶۸ھ) لکھتے ہیں کہ قرآن کریم کے لحاظ سے ربا کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ربا حلال ہے اور ایک ربا حرام ہے جو ربا حلال ہے وہ یہ ہے کہ ایک شخص کسی کو کوئی چیز ہدیہ میں دے اور اس سے افضل چیز کا طالب ہو"۔ (تفسیر تبیان القرآن، ج ۹، ص ۱۹۵)

مذکورہ بالا تصورات کی جھلک لسان العرب میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔

قال ابو اسحٰق: یعنی به دفع الانسان الشیء لیعوض ما هو اکثر منه و ذلک فی اکثر التفسیر لیس بحرام ولکن لا ثواب لمن زاد علی ما اخذ قال والربا ربوان، فالحرام کل قرض یؤخذ به اکثر منه او تجرّ به منفعة فحرام، والذی لیس بحرام ان یهبه الانسان یستدعی به ما هو اکثر او یهدی الهدیة لیهدی له ما هو اکثر منها۔ (لسان العرب، علامہ ابن منظور، المجلد الرابع عشر، ص ۳۰۴، نشر ادب الحوزہ، ایران ۱۴۰۵ھ)

(۲) عن زید بن اسلم انه قال الربا فی الجاهلیة ان یکون للرجل علی الرجل الحق الی اجل فاذا حل الحق قال اتقضی ام تربی فان قضی اخذ والا زاده فی حقه واخر عنه فی الاجل. (موطا امام مالک، کتاب البیوع، باب ما جاء فی الربا فی الدین، رقم الحدیث ۳۸، میر محمد کتب خانہ مرکز علم و ادب آرام باغ کراچی)

مطالعہ قرآن میں مکّی اور مدنی آیات کے علم کی اہمیت

ڈاکٹر ریحانہ فردوس

اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ علوم اسلامی، جامعہ کراچی

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ علوم قرآنیہ میں سب سے اہم مکی اور مدنی آیات کا علم ہے۔ اس علم کو حاصل کرنے کے لیے روایات کی بحث وتمحیص، نصوص آیات کی تحقیق اور ان تمام امور کا تاریخ سے تعلق پیدا کرنا بھی اتنا ہی ضروری ہے۔ علم اسباب نزول کی افادیت سے انکار نہیں۔ لیکن محض اسباب نزول سے قرآن کی کلی حقیقت سامنے نہیں آتی۔ لیکن مکی اور مدنی آیات کے علم کے لیے ضروری ہے کہ تمام سورتوں اور آیتوں کا مجموعی طور پر احاطہ کیا جائے۔ کیونکہ یہ معلوم ہے کہ قرآن میں سورتیں یا تو مکی ہیں یا مدنی۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ مکی سورتوں میں مدنی آیات موجود نہیں۔ اور مدنی سورتوں میں مکی آیات۔ قرآن کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ اس کی ہر آیت کی اپنی ایک علیحدہ شخصیت اور واضح سیرت ہے۔

چنانچہ جب کوئی ایسی آیت اپنے زمرہ سے نکل کر کسی دوسرے زمرہ میں داخل ہو جائے تو اس کا پتہ لگانا بہت ضروری ہوتا ہے کہ اس کا اصل مقام کہاں تھا اور وہ یہاں کیوں آئی۔ یہ کام ائمہ علماء نے دقیق نقدی جائزہ سے انجام دیا ہے۔ اور تقریباً حتمی طور پر اس طرح کی تمام آیات کا تعین کر دیا ہے اور اس سے مجموعی طور پر قرآن کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ اسی لیے مکی اور مدنی آیات کا علم اہم ثابت ہوا کہ علماء نے اس کی تحقیق پر غیر معمولی توجہ دی اسی سے دعوت اسلامیہ کے مراحل کا پتہ چل سکتا ہے۔ اور اسی سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ کس طرح واقعات اور حالات کے ساتھ وحی کے نزول میں بھی تدریج کا سلسلہ جاری رہا۔

اور یہ بات بھی کہ عرب کے اجتماعی حالات میں عموماً اور مکہ و مدینہ کے خصوصاً کہاں تک اس تدریجی حکمت سے کام لیا گیا ہے۔ اس مطالعہ سے یہ بات بھی معلوم ہوگی کہ کس طرح قرآن نے اپنی تعلیم وتربیت میں ہدایت اور حضانت کی ضروریات کا لحاظ رکھا اور اس کے لیے مختلف طرز خطاب اختیار کیا۔ اور اسی سے یہ بھی پتہ چلے گا کہ اس نے مومنین اور مشرکین اور اہل کتاب کے ساتھ تلقین اور استدلال کا کیا طریقہ اختیار کیا۔

علماء نے جب اس علم کے مختلف اور وسیع شعبوں کا احاطہ کیا تو اسے کئی حصوں میں تقسیم کرنا ضروری معلوم ہوا۔ مثلاً یہ کہ کبھی تو ان آیات کا مطالعہ ترتیب زمانی کے اعتبار سے کبھی تحدید مکانی کے لحاظ سے کبھی تبویب موضوعی کے خیال سے اور کبھی تعیین شخصی کے نقطہ نظر سے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب علماء نے اس علم کی طرف توجہ کی تو یہ تمام اعتبارات ان کے ذہن میں بازگشت کر رہے تھے۔ چنانچہ جن لوگوں نے کہا کہ مکی آیات وہ ہیں جو مکہ میں نازل ہوئیں چاہے وہ ہجرت کے بعد نازل ہوئی ہوں اور مدنی وہ ہیں جو مدینہ میں نازل ہوئیں تو ان لوگوں نے، مکان کا اعتبار کیا۔ جن لوگوں نے کہا کہ مکی وہ آیتیں ہیں جن میں اہل مکہ سے خطاب ہوا ہے اور مدنی وہ ہیں جن میں اہل مدینہ سے خطاب ہوا ہے۔ تو اس تقسیم میں اشخاص مخاطبین کی رعایت کی گئی ہے۔ اور جن لوگوں نے کہا کہ وہ آیات جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجرت مدینہ سے پہلے نازل ہوئیں وہ مکی ہیں چاہے ان کا نزول مکہ سے باہر ہوا ہو اور وہ جو ہجرت کے بعد نازل ہوئیں وہ مدنی ہیں چاہے ان کا نزول مکہ میں ہوا ہو۔(۱)

اور اس آخری ترتیب میں دعوت اسلامیہ کے مراحل کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ لیکن ان تینوں ترتیبوں کے علاوہ ایک چوتھی ترتیب بھی ہے۔ وہ ترتیب موضوعی ہے۔ یعنی نفس مضمون کے اعتبار سے آیات اور سورتوں کی تقسیم مثلاً سورۃ الممتحنہ شروع سے آخر تک مدینہ میں نازل ہوئی اگر ہم اس کو مکان کے اعتبار سے دیکھیں۔ وہ ہجرت کے بعد نازل ہوئی۔ اگر ہم اس کو زمان کے اعتبار سے دیکھیں۔ اس میں خطاب اہل مکہ سے ہے، اگر ہم اشخاص کا اعتبار کریں۔ اس پوری سورۃ کا مقصد اجتماعی طور پر مسلمان کے دلوں کا امتحان اور تزکیہ ہے، اگر ہم موضوع کے اعتبار سے دیکھیں۔ اس لیے علماء نے کہا ہے کہ یہ سورۃ تو مدنی ہے لیکن اس کا حکم مکی ہے۔(۲)

اسی طرح سورۃ الحجرات ہے۔ جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

یاایھا الناس انا خلقنکم من ذکر وانثی وجعلنکم شعوبا وقبائل لتعارفوا۔ (الحجرات: ۱۳)

اگر ہم مکان کا خیال کریں تو یہ مکہ میں نازل ہوئی زمان کا خیال کریں تو ہجرت کے بعد فتح مکہ کے دن

نازل ہوئی اور موضوع کے اعتبار سے اسے دیکھیں تو اس میں بتایا گیا ہے کہ انسان کی اصل حقیقت کیا ہے۔ اور یہ کہ تمام انسانوں کو اللہ تعالیٰ نے ایک وحدت میں پیدا کیا اور اشخاص کا اعتبار کریں تو اس میں اہل مکہ اور اہل مدینہ دونوں سے خطاب ہے۔ اس کے بارے میں علماء نے کہا ہے کہ یہ مکہ میں نازل ہوئی لیکن اس کا حکم مدنی ہے۔ (۳)

زمنی تقسیم:

صبحی صالح اپنی کتاب علوم القرآن میں رقمطراز ہیں کہ زمنی تقسیم کو دوسری تمام تقسیمات پر فضیلت حاصل ہے۔ کیونکہ اس کا تاریخ سے گہرا تعلق ہے۔ اگر ہم تو ب مکانی کا اعتبار کریں تو ہم تحقیق سے بتا سکتے ہیں کہ مکہ اور مدینہ میں شروع کے ایام میں کون سی آیتیں نازل ہوئیں۔ اور بیچ میں کون سی اور آخر میں کون سی۔ لہٰذا یکے بعد دیگرے ان حالات کا وارد ہونا ہمیں مجبور کرتا ہے کہ ہم ترتیب زمانی اختیار کریں کیونکہ اس کے بغیر دعوت کی تدریج کا صحیح نقشہ سامنے نہیں آسکتا۔ رہا اشخاص اور موضوعات کا تعین تو ان کی حیثیت ثانوی ہے۔ جس کا تعلق موقع کی مناسبت سے ہوتا ہے۔ اور اس زمنی ترتیب سے جس کے اندر واقعات و حالات خود بخود آجاتے ہیں۔ (۴)

یہ تاریخی زمنی ترتیب وہ ہے جو نفسیاتی زاویوں اور اجتماعی حالات سے صرف نظر نہیں کرتی اور زندگی اور معاشرہ کے افراد سے تجاہل برتی۔ اسی لیے ہمارے محققین علماء نے اس ترتیب کو بے حد اہمیت دیتے ہوئے کہا ہے کہ جو شخص دعوت اسلامیہ کے ان مراحل سے واقف نہ ہو اسے چاہیے کہ وہ ہرگز کتاب اللہ کی تفسیر کا خیال نہ کرے۔ جیسا کہ کہ ابوالقاسم حسن بن محمد نیشاپوری (م ۴۰۶ھ) نے کیا ہے کہ علوم قرآنی میں سب سے اشرف علم اس کے نزول اور جہات کا علم ہے اور یہ کہ کون سی آیتیں ابتداء میں نازل ہوئیں کون سی وسط میں کون سی آخر میں، اور اسی طرح کون سی مدینہ میں اور کون سی مکہ میں پھر یہ کہ کون سی آیات ہیں جو نازل مکہ میں ہوئیں مگر ان کا حکم مدنی ہے کون سی مدینہ میں نازل ہوئیں مگر ان کا حکم مکی ہے۔ (۵) اس قول سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ انہوں نے قرآن کی تقسیم چھ زمنی مراحل میں کی ہے۔ تین مکی اور تین مدنی جن کو ابتدائی، وسطی اور ختامی قرار دیا ہے۔

مستشرقین اور قرآن کی زمنی ترتیب:

مستشرقین نے بھی قرآن کو اسباب نزول کے اعتبار سے چار یا چھ مراحل میں تقسیم کیا ہے۔ اس میں تو خیر فی نفسہ کوئی خرابی نہیں۔ ہمارے علمائے نے بھی یہ کیا ہے۔ خرابی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب

اس ترتیب میں نزول سے متعلق صحیح روایات کا بالکل خیال نہ کیا جائے۔ اور خالص وقتی رائے کا اعتبار کرلیا جائے۔ اسی لیے ہمارے علمائے نے قرآن کی ہر آیت کا جائزہ لیا ہے اور اس کی تاریخ لکھی ہے۔ اور اس سے متعلق چھوٹی سی چھوٹی جزئیات تک کا تذکرہ کیا ہے۔ تاکہ آیت کو سمجھنے میں آسانی ہو اور سیاق کلام میں اس کا تعین ہو سکے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ مستشرقین ان تنزیلی روایات کا بالکل اعتبار نہیں کرتے۔ اور کہتے ہیں کہ سیرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اعتماد کر کے قرآن کی ترتیب قائم نہیں کی جا سکتی۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ سیرت کے واقعات کو سامنے رکھ کر قطعی طور پر قرآن کی آیات کی ترتیب متعین نہیں کی جا سکتی۔

اس سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ انہوں نے قرآن کی زمنی ترتیب کی تو پوری کوشش کی ہے۔ لیکن اس سلسلے میں تمام روایات صحیحہ کو مسترد کر دیا ہے۔ اگر مستشرقین صحیح روایات پر بحث کرتے اور صرف انہیں کو قبول کرتے جن کی سند قطعی طور پر قابل اعتبار ہوتی تو اس میں کوئی حرج نہیں تھا۔ کیونکہ خود علمائے اسلام نے ضعیف روایات کو رد کر دیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بعض مستشرقین نے یہی طریقہ اختیار کیا ہے جیسے H. Grimme کہ اس نے قرآنی سورتوں کی ترتیب میں اسلامی اسانید اور روایات پر اعتماد کیا ہے۔ لیکن اس نے صحیح اور سقیم میں فرق نہیں کیا ہے اور اکثر ضعیف اور باطل اسناد کو قبول کیا ہے۔ (۶) مستشرقین میں سب سے اہم کام Noldeke کا ہے۔ اس نے بھی زمنی ترتیب کو مقدم رکھا ہے۔ لیکن اس نے تحقیق کا اسلامی طریقہ اختیار نہیں کیا ہے۔ اور ایک ایسا طریقہ ایجاد کیا ہے جس پر بعد کے تمام مستشرقین متفق ہو گئے ہیں۔ اور اس سے انہوں نے مطالعہ قرآن کے سلسلہ میں نہایت خطرناک نتائج اخذ کیے ہیں۔

انیسویں صدی کے وسط میں یورپ میں قرآن کی سورتوں کی ترتیب اور اس کے تاریخی مراحل کا مطالعہ خاص طور پر شروع ہوا اس سلسلہ میں ولیم مور خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ جس نے قرآنی مراحل کو چھ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ جن میں پانچ کا تعلق مکہ سے اور چھٹے کا مدینہ سے ہے۔ اس نے اس تقسیم میں بہت بڑی حد تک سیرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اعتماد کیا اور ان اسانید پر جو سیرت سے متعلق تھیں۔ اور اپنے تبصرہ میں بڑی حد تک تاریخی معلومات سے فائدہ اٹھایا۔ دوسرا شخص جرمنی کا مشہور مستشرق Weil تھا جس نے 1844ء سے 1872ء تک ترتیب قرآن کا کام کیا۔ اس نے اسلامی روایات اور اسانید کو سرے سے خارج کر دیا۔ اسی لیے بعد کے مشہور مستشرق Blachere نے اس نظریہ کو قبول کرتے ہوئے کہا کہ یہی وہ واحد طریقہ ہے جس سے کامیابی کے ساتھ ہم صحیح نتیجہ پر پہنچ سکتے

ہیں۔

Weil کے اس نظریہ کو صرف بلاشیر نے نہیں۔ اس کے بعد آج تک تمام مستشرقین نے قرآن کے مطالعہ میں اساس کا درجہ دیا ہے۔ اس نظریہ کو Noldeke نے اپنی مشہور کتاب تاریخ القرآن میں بہت تفصیل سے اور اپنی دانست میں بہت مدلل طریقے سے پیش کیا ہے۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ 1860ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد اس کے شاگرد شوالی Sehwally نے اس میں کچھ اضافے کیے اور دوبارہ شائع کیا یہ کتاب آج تک مغرب میں قرآن کے مطالعہ کے سلسلہ میں سب سے اہم سمجھی جاتی ہے۔ لہٰذا اس طریقے سے اسکاٹ لینڈ کے پروفیسر Bell انگلستان کے Rwdwell سب متاثر ہوئے اور ان لوگوں نے یہ نظریہ قائم کیا کہ قرآن اپنی تفسیر آپ ہے۔

اور خود اسی سے دعوت اسلامیہ کے مراحل، سورتوں کی ترتیب اور قرآنی تعلیمات کی تدریج کا پتہ چل سکتا ہے۔ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ سیرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان روایات سے جو آپ کے متعلق صحابہ بیان کرتے ہیں مستقلاً قرآن کی توضیح میں کوئی مدد نہیں مل سکتی۔ ہاں جزوی طور پر کچھ فائدہ ہو سکتا ہے۔ (۸)

لیکن علمائے اسلام کا نظریہ اس کے خلاف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن کی ترتیب متعین کرنے میں اور ترتیب زمنی پر اسے قائم کرنے میں روایات صحیحہ کا استعمال وہ واحد طریقہ ہے جس سے ہم حقیقت تک پہنچ سکتے ہیں۔ اور یہ بات اس لیے صحیح ہے کہ یہ تمام روایتیں یا تو صحابہ سے منقول ہیں جنہوں نے وحی کو اترتے دیکھا اور اس کا زمانہ دیکھا یا تابعین سے جنہوں نے صحابہ سے ان باتوں کو بالتفصیل سنا۔ ان تمام روایتوں کے جمع کرنے اور ان کا تنقیدی جائزہ لینے سے یہ بات تحقیقی طور پر معلوم ہو سکتی ہے کہ کون سی آیت مکی ہے اور کون سی مدنی اور وہ کس سیاق میں نازل ہوئی ہے۔ اس کا اصل موضوع کیا ہے اور اس کا خطاب کس سے ہے۔ تاہم یہ باتیں چونکہ ہر جگہ ہر آیت سے متعلق واضح نہیں ہیں۔

اس لیے ہمارے علماء نے صحیح روایت پر اعتماد کرنے کے علاوہ فکر و اجتہاد سے بھی کام لیا ہے۔ خصوصاً ان موضوعات کے متعلق جن کے بارے میں کوئی نص صریح موجود نہیں ہے۔ یعنی کوئی روایت نقل نہیں کی گئی۔ اور جب کسی آیت کے متعلق قطعی طور پر کوئی بات معلوم نہ ہو تو ترجیحی طور پر ہم بعض روایتوں کو قبول کر سکتے ہیں۔ اور بعض آراء اور اجتہاد کو بھی اس میں کوئی بات عقلاً محال نظر نہیں آتی۔ کیونکہ جہل کا علاج ہمیشہ قطعی علم سے نہیں ہوتا۔ بلکہ علم و معرفت کے لیے ترجیحات سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ (۹) یعنی ہم کہہ سکتے ہیں کہ غالباً فلاں آیت اس موقع پر نازل ہوئی اور اس کا موضوع یہ اور یہ تھا اور اس سے فلاں اور

فلاں کی طرف خطاب ہے اس طرح کے یقین سے علم میں یقیناً اضافہ ہوتا ہے اور اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ تاہم ہمارے علماء نے مکی اور مدنی سورتوں کی کچھ کیفیات دریافت کی ہیں جن سے وہ عام طور پر پہچانی جا سکتی ہیں۔ ان میں سے چند خصائص کا ذکر ہم ذیل میں کرتے ہیں۔

۱۔ ہر سورۃ جس میں سجدہ کا ذکر ہو وہ مکی ہے۔

۲۔ ہر سورۃ جس میں لفظ 'کلا' ہو مکی ہے۔ اور یہ لفظ قرآن کے آخری نصف میں وارد ہوا ہے۔

۳۔ ہر سورۃ جس میں 'یایھا الناس' کے کلمات آئے ہیں۔ مکی ہے بجز سورۃ حج کے کہ جس کے اواخر میں آیا ہے۔ **'یاایھا الذین امنوا ارکعوا واسجدوا'** اکثر علماء کہتے ہیں کہ آیت مکی ہے۔

۴۔ ہر وہ سورۃ جس میں انبیاء اور پچھلی امتوں کے قصے آئے ہیں مکی ہے سوائے سورۃ البقرہ کے۔ (۱۰)

۵۔ ہر سورۃ جس میں آدم و ابلیس کا قصہ آیا ہے وہ مکی ہے۔ سوائے سورۃ البقرہ کے۔ (۱۱)

۶۔ ہر سورۃ جس کی ابتدا حروف تہجی سے ہوئی ہے جیسے الم، الر وغیرہ تو وہ مکی ہیں۔ (سوائے سورۃ البقرہ اور آل عمران) اور سورۃ الرعد کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ مکی ہے اور بعض کہتے ہیں کہ وہ مدنی۔ (۱۲)

یہ وہ چھ خصائص ہیں کہ جن میں بعض استثنائی سورتوں کو علیحدہ کر دیا جائے تو یہ مکی ہونے کی قطعی نشانیاں ہیں۔ اور ان کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں۔ ان کے علاوہ کچھ غالب نشانات ہیں۔ جن کے ذریعہ قسم مکی کا تعین ہو سکتا ہے۔ چنانچہ مکی سورتوں میں ذیل کے امور ہم بہت کثرت سے پاتے ہیں۔

۱۔ ان میں آیتیں اور سورتیں عام طور پر بہت چھوٹی اور مختصر ہیں ان کے باوجود ان کے اندر جوش اور تعبیر کی حرارت اور صوتی حسن اور عظمت بے انتہا ہے۔

۲۔ اللہ اور یوم آخر پر ایمان کے اصول کی طرف دعوت اور جنت و دوزخ کی تصویر۔

۳۔ کریمانہ اخلاق خیر اختیار کرنے اور خیر و نیکی پر قائم رہنے کی دعوت۔

۴۔ مشرکین سے مناظرہ اور ان کے فضول خیالات کی تردید۔

۵۔ عربوں کی عادت کے مطابق بار بار قسم کھانا۔

اور مدنی سورتوں کی قطعی خصوصیات یہ ہیں۔

۱۔ ہر سورۃ جس میں جہاد کی اجازت یا ذکر اور اس کے احکام بیان ہوئے ہوں وہ مدنی ہے۔

۲۔ ہر سورۃ جس میں حدود، فرائض، حقوق اور مدنی اور اجتماعی و بین الاقوامی قوانین کے احکام بیان کیے گئے ہوں وہ مدنی ہے۔ (۱۳)

۳۔ ہر سورۃ جس میں منافقین کا ذکر ہو۔ وہ مدنی ہے بجز سورۃ عنکبوت کے کہ وہ مکی ہے۔ لیکن اس کی شروع کی گیارہ آیات مدنی ہیں۔ انہیں میں منافقین کا ذکر ہوا۔ (۱۴)

۴۔ اہل کتاب سے مناظرہ اور ان کو اس بات کی دعوت کہ اپنے دین میں غلو نہ کریں۔

ان کے علاوہ بعض ایسے غالب آثار بھی ملتے ہیں جن کی وجہ ہم کسی سورۃ کو مدنی قرار دے سکتے ہیں ان میں سے دو یہ ہیں۔

۱۔ اس کی اکثر سورتیں بلکہ بعض آیات بھی طویل ہیں۔ ان کا انداز بیان تشریحی ہے۔ ان کے مضامین بہت مختلف طریقے سے بیان کیے گئے ہیں۔

۲۔ ان سورتوں میں حقائق دینیہ کے براہین و دلائل تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔

یہ موضوعی اور اسلوبی خصائص خواہ وہ قطعی ہوں یا ظنی ہوں۔ یہی وہ حکیمانہ طریقہ اور انداز بیان مقرر کرتے ہیں جن کو اسلام نے اپنے تشریعی سلسلے میں اختیار کیا۔ چنانچہ یہ ممکن نہیں تھا کہ اہل مدینہ سے بھی وہی خطاب کیا جائے جیسے اہل مکہ سے کیا تھا۔ کیونکہ مدینہ کا نیا ماحول اس بات کا متقضی تھا کہ اس میں قانونی تفصیلات پیش کی جائیں اور ایک نئے معاشرے کی تشکیل کے اصول بیان کیے جائیں۔ لہٰذا یہ ضروری ہوا کہ مکی آیتوں اور سورتوں کے انتشار اور اجمال کے بعد اب تفصیل سے کام لیا جائے اور آیتوں اور سورتوں دونوں میں مخاطبین کے حالات کی رعایت کی جائے۔

مکہ میں ایک ایسی قوم بستی تھی جو سرکش اور دشمن تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمانوں کو سخت اذیت پہنچاتی تھی اس لیے مناسب ہوا کہ مکہ میں رسول پر اس طرح کا قول نازل ہو۔ قد نعلم انه ليحزنك الذى يقولون ۔ (۶:۳۳) "ہم کو معلوم ہے کہ ان (کافروں) کی باتیں تمہیں رنج پہنچاتی ہیں"۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ قول ولقد كذبت رسل من قبلك ۔ (۶:۳۴) "اور تم سے پہلے پیغمبر بھی جھٹلائے جاتے رہے"۔

اور اللہ تعالیٰ کا یہ قول ولو فتحنا عليهم بابا من السماء فظلوا فيه يعرجون ۔ لقالوا انما سكرت ابصارنا بل نحن قوم مسحورون ۔ (۱۵:۱۴۔۱۵) "اور اگر ہم آسمان کا دروازہ ان پر کھول دیں اور وہ اس میں چڑھنے بھی لگیں تو بھی یہی کہیں گے کہ ہماری آنکھیں مخمور ہو گئیں ہیں بلکہ ہم پر جادو کر دیا ہے"۔ اس طرح مکہ میں کثرت سے ایسی آیتیں نازل ہوئی ہیں جن میں مشرکین سے سختی سے کلام کیا گیا ہے۔ اور ان میں ان کے بیہودہ خیالات کی تردید کی گئی ہے۔ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مومنین کو تسلی دی گئی ہے۔ اور ان کو رواداری اور اچھے طریقے سے درگذر کرنے کی تعلیم بھی دی گئی ہے۔

اور مدینہ میں ہجرت کے بعد تین قسم کے لوگ پائے گئے۔ مومنین، جن میں مہاجرین اور انصار شامل تھے۔ پھر منافقین، اور یہود۔ قرآن نے یہودیوں سے مناظرہ کیا اور ان کو ایک کلمہ یعنی توحید کی طرف دعوت دی اور منافقین کے باطنی فساد اور بدنیتی کو ظاہر کیا اور مومنین کی ایک طرف ہمت افزائی کی کہ وہ راہ مستقیم پر چلتے رہیں اور دوسری طرف ان کو امن اور جنگ انفرادی اور اجتماعی زندگی، سیاست اور اقتصاد کی تعلیم دی۔ چنانچہ اگر مکہ میں زکوٰۃ کو فرض کیا ہوتا جب کہ مسلمان مفلس تھے اور طرح طرح کی اذیتوں کا شکار تھے۔ تو اس حکم سے کوئی فائدہ نہ ہوتا۔

اسی طرح مکہ میں اگر صلوٰۃ خوف کا حکم آیا ہوتا تو وہ بیکار تھا کیونکہ یہ اجازت تو یہ صرف جنگ کے زمانے میں ہوتی ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ مکی سورتوں میں سرے سے جہاد کا کوئی ذکر نہیں۔ ان باتوں پر غور کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ قرآن کی کون کون سی سورتیں ابتدائی، کونسی سورتیں وسطی اور کون سی ختامی ہیں۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ ان میں سے بعض کا نزول آگے پیچھے ہوا ہو۔ لیکن جو خصائص ہم نے بیان کیے ہیں۔ اس کی روشنی میں اس تدریج کا تعین کرنا زیادہ مشکل نہیں۔ اسی لیے مورخین اور مفسرین نے اس امر پر اتفاق کیا ہے کہ ذیل کی سورتیں یقینی طور پر مکی عہد کی ابتدائی سورتیں ہیں۔ (۱۵)

العلق، المدثر، التکویر، الاعلیٰ، اللیل، الشرح، العادیات، التکاثر، النجم۔ اور وسطی مرحلے کی واضح سورتیں یہ ہیں۔ عبس، التین، القارعۃ، القیامۃ، المرسلٰت، البلد، الحجر۔ اور ختامی مرحلے کی واضح سورتیں یہ ہیں۔ الصافات، الزخرف، الدخان، الذاریات، الکہف، ابراہیم، السجدہ۔ (۱۶)

پہلے مرحلے کی سورتوں کی خصوصیات:

ان میں وحی اور دین کی حقیقت بیان کی گئی ہے۔ اللہ کی قدرت کے اوصاف اور اس کی رحمت کے آثار بیان کیے گئے ہیں۔ کہا گیا ہے کہ جس طرح انسان پہلی مرتبہ پیدا کیا گیا ہے اسی طرح دوبارہ بھی پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اور ان میں قیامت کے مناظر کا تذکرہ ہے۔ مشرکین کو ڈرایا گیا ہے کہ ان کے اوپر بھی اس طرح کا عذاب آ سکتا ہے جیسا کہ جھٹلانے والی پہلی قوموں پر آ چکا ہے اور ان میں جزا بدی اور ثواب وعذاب کا نظریہ پیش کیا گیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ تمہاری قوم تمہیں اذیت پہنچاتی ہے تو اسی طرح کی اذیت پچھلے رسولوں کو بھی پہنچ چکی ہے۔ جو کار نبوت میں آپ کے بھائی تھے۔ عقائد کے اصول بیان کیے گئے تو بتایا۔ خدا کے نزدیک دین ایک ہی ہے۔ اور اسی طرح ان میں یہ اشارہ بھی موجود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ دعوت ایک عالمی دعوت ہے۔ یہ تمام امور مختلف